© rasailojaraid.com

ترکِ سبب

محمد اجمل

علامہ اقبال نے کچھ عرصہ معلّمی کی ہے۔ لیکن ان کے بہت کم شاگردوں نے ان کے طرزِ تدریس و تعلیم کی وضاحت کی ہے، غالباً جماعت اور نصابی کتابوں کی محدود فضا اقبال کے لئے روحانی قید و بند کے مترادف تھی، اس لئے معلّمی بحیثیت ایک پیشے کے انہوں نے ہمیشہ کے لئے ترک کر دی لیکن فلسفے کی تعلیم سے اپنے شغف کو برقرار رکھنے کے لئے وہ بہت مدت تک پنجاب یونیورسٹی کے ایم۔ اے فلاسفی کے خارجی ممتحن رہے۔

آخری عمر میں جب ان کی بینائی کمزور ہو گئی تھی، تو اپنے حلقۂ احباب یا حلقۂ ارادت کے کچھ ارکان کو یہ ہدایت کر رکھی تھی، کہ جب وہ کوئی اچھی نئی کتاب پڑھیں تو اس کا خلاصہ انہیں بتا دیا کریں، چنانچہ ہمارے استاد مکرّم خواجہ عبدالحمید صاحب مرحوم کے ذمے ہی فلسفہ آیا، اور وہ وقتاً فوقتاً علامہ اقبال کو فلسفے کی نئی کتابوں کے خلاصے بتا دیا کرتے تھے، خواجہ عبدالحمید مرحوم گورنمنٹ کالج لاہور میں ہمارے شفیق، قابل اور محترم اُستاد تھے، اُنھوں نے ایک مرتبہ مجھے بتایا کہ جب میں نے علامہ کو وٹگین شٹائن (wittgenstein) کی Tractatus Logico-Philosophicus کے مضامین سے آگاہ کیا، تو علامہ بہت متاثر بھی ہوئے اور یہ بھی فرمایا کہ خدا جانے، مغرب کا فلسفہ کدھر جا رہا ہے! وٹگین شٹائن (wittgenstein) کا ذکر آیا، تو علامہ اقبال سے اس کی کچھ مماثلت بھی نظر آتی ہے، دونوں طبعاً معلّم تھے، دونوں تصوّف سے متاثر تھے۔ دونوں جدید تعلیمی اداروں سے بیزار تھے، اور دونوں مدرسے کو چھوڑ تمام دنیا کے معلّم بن گئے، علامہ اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور کی معلّمی اس لئے چھوڑی کہ وہاں فکر و نظر کی آزادی نہیں تھی، وٹگین شٹائن نے کیمبرج سے اس لئے کوچ کیا کہ اس نے یونیورسٹی کی فضا میں علمی بد دیانتی غالب دیکھی، دونوں کے ہاں مسئلۂ اخلاق بہت اہم ہے۔ الٰہیات کے بارے میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ حقیقت الفاظ میں نہیں سما سکتی۔

علامہ اقبال نے جب سرکاری ملازمت کو ترک کیا، اور عالمِ اسلام کی تعلیم و تربیت پر کمربستہ ہوئے تو ان کا تعلیمی انداز بدستور قائم رہا۔ اس کی ایک شہادت تو یہ ہے کہ ان کے ہاں مکالمے کی صنف حاوی ہے۔ اور ان مکالموں کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے روحانی سفر میں خود کسی اُستاد کے شاگرد بن جاتے ہیں۔ مثلاً "پیرِ رومی" ان کے روحانی سفر میں راہ نما بھی ہیں اور استاذ بھی ہیں۔ اور وہ زندہ رود یا بعض اوقات "مریدِ ہندی" کی حیثیت سے ان سے سوال کرتے ہیں نہایت ادب، احترام اور محبت کے ساتھ۔ اور بعض سوال تو ہیں ہی علم کی حقیقت اور تعلیم کے انداز کے بارے میں۔ اور لبسا اوقات سوال علم اور عمل، دین اور دنیا، تخیل اور ذہانت، عقل و عشق کے موضوعات پر کرتے ہیں، اور یہ جواب اپنی شاعری کے توسط سے علامہ اپنی قوم اور ساری دنیا تک پہنچا دیتے ہیں۔ مثلاً جب وہ پیرِ رومی سے سوال کرتے ہیں:

آسمانوں پر میرا فکرِ بلند میں زمیں پر خوار و زار و دردمند
کارِ دنیا میں رہا جاتا ہوں میں ٹھوکریں اس راہ میں کھاتا ہوں میں

تو پیرِ رومی جواب دیتے ہیں:

ہر کہ بر افلاک اشارش بود بر زمیں رفتن چہ دشوارش بود

علامہ اقبال نے جو یہ سوال کیا، اگرچہ بظاہر اس میں اپنی ذات کا مسئلہ پیش کیا گیا تھا، لیکن دراصل یہ مسئلہ ساری مسلمان قوم بلکہ تیسری دنیا کے ممالک کا تھا کہ خوش فہمیوں اور بلند بانگ دعووں پر زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس کا جواب کتنا جامع ہے۔ یہ جواب سن کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کسی کمزور بنیاد والی عمارت کے گرنے سے دھماکہ ہوا ہے یا کوئی غبارہ پھٹ گیا ہے یا ادراک کے گرد سپنوں کا جالا ٹوٹ گیا ہے۔ اس دھماکے سے انسانی حواسِ خمسہ کو حقیقت کے مشاہدے پر آمادہ کرتا ہے اور نرگسیت (Narcissim) کی نابینائی سے نجات حاصل کر کے شعورِ حال کی آنکھوں میں روشنی پیدا کرتا ہے۔ پھر کبھی کبھی وہ علم کے بارے میں سوال کرتے ہیں:

علم و حکمت کا ملے کیوں کر سراغ؟ کس طرح ہاتھ آئے سوز و درد و داغ؟

رومی جواب دیتے ہیں:

علم و حکمت زاید از نانِ حلال عشق و رقت آید از نانِ حلال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"نانِ حلال" پر اس قدر زور کیوں ہے؟ اس لئے کہ "نانِ حرام" سے اس قسم کی احتیاج پیدا ہوتی ہے جو علم و تجسس کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے، اور سوز و رقّت کے لئے دل کو یکسوئی اور وحدتِ فکر و ذکر کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی نانِ حرام سے ٹوٹ جاتی ہے۔ اسی لئے غالباً اسلامی تہذیب و ثقافت میں جب بچے کو کسی فن کی تعلیم دی جاتی ہے تو باقاعدہ ایک مذہبی رسم آغاز یا بسم اللّٰہ ادا کی جاتی تھی، جس کا ایک مفروضہ یہ بھی ہوتا تھا کہ بچہ جس فن کی تربیت حاصل کر رہا ہے اسے حاصل کرنے کے لئے اس میں صلاحیت موجود ہے، اس صلاحیت کو پہلے جانچا جاتا تھا، اس کے بعد یہ رسم ادا ہوتی تھی، گویا ہر فن ایک مقدس فریضہ ہے، جسے پورا کرنے کے لئے اسے اپنی اخلاقی قدروں سے وابستہ رہنا پڑے گا۔ اور وہ صدقِ دِل سے یہ کام کرے گا۔ "صدقِ دل" سے مراد یہ ہے کہ طالب علم کام کو اپنی "انا" کے تابع نہیں کرے گا۔ بلکہ "انا" کو کام کے تابع کرے گا۔ "انا" کی چھوٹی چھوٹی ہزاروں خواہشیں صدقِ دل میں خلل انداز ہوتی ہیں، اسی لئے فرمایا "ان کی اُمیدیں قلیل ان کے مقاصد جلیل۔" جلیل مقاصد "انا" کو مستحکم نہیں کرتے اور خودی جو براہِ راست خدا کے تخلیقی عمل سے وابستہ ہے اس کی تربیت کرتے ہیں۔ "نانِ حلال" کی اہمیّت کسی محض دنیوی نظام میں یا محض دنیوی نظام میں یا محض دنیوی رویے میں لایعنی معلوم ہوتی ہے، وہ ایک پالیسی تو ہو سکتی ہے اخلاقی اور مذہبی اصول نہیں بن سکتی۔ مذہبی اقدار کو اس طرح منتشر کرنے سے جو عمل "یالاتقدسیت" (Desocialisation) کا آج کل مغرب میں جاری ہے۔ اس سے متاثر ہو کر علامہ نے جذبۂ تقدّس کی احیا کی اہمیت بتائی ہے۔ یعنی تسخیرِ کائنات تو کرو، لیکن جذبۂ تقدّس کو بحال رکھ کر بلکہ اسی کی اساس پر تسخیرِ کائنات کے ولولے کی تعمیر کرو۔

ایک نظم "خطاب بہ جاوید" میں کہتے ہیں:

سرِّ دیں، صدقِ مقال، اکلِ حلال   خلوت و جلوت تماشائے جمال

علاّمہ نے یہاں صدقِ مقال اور اکلِ حلال کے رشتے کو سرِّ دیں قرار دیا ہے، کیونکہ رزقِ حرام میں کسی خارجی طاقت کی احتیاج پیدا ہوتی ہے، یا کسی کے سامنے آنکھیں جھک جاتی ہیں اور گردن خم ہو جاتی ہے، اس حجاب کی بنا پر صدقِ مقال میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ دل کی رونق برباد، اور عقل کی حیلہ جوئی اور تادیل طرازی ترقی کرتی ہے، نگاہیں ندامت سے بھی جھکتی ہیں، لیکن جذبۂ تقدس سے بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جھک جاتی ہیں۔ جذبۂ تقدس سے جھکنے والی آنکھ کی نیکی کا نام ادب ہے۔ اور علامہ نوجوانوں میں "ادب" کی صفت کی تربیت بہت ضروری سمجھتے ہیں، اس نظم میں فرماتے ہیں:

دیں سراپا سوختن اندر طلب — انتہائش عشق و آغازش ادب

آبروئے گل ز رنگ و بوئے اوست — بے ادب، بے رنگ و بوئے آبروست

نوجوانے را چو بینم بے ادب — روزِ من تاریک می گردد چو شب

گویا ادب ابتدا ہے عشق کی، بے باک عقل بہت دل آویز اور قابلِ احترام ہے اگر وہ نورِ ادب و عشق سے روشن ہو۔

عقلہا بے باک و دلہا بے گداز — چشمہا بے شرم و غرق اندر مجاز

کتنی "نیم راست باتیں" (Half Truths). ہیں جو ہم محض دل لگانے کے لئے بولتے ہیں یا اپنی زخمی انا پر جعلی مرہم رکھنے کے لئے کہتے ہیں، بظاہر یہ بے باکی ہے لیکن عقل کی بے باکی میں بھی چالوں کے منصوبے پنہاں ہوتے ہیں۔ ایک سوچی سمجھی ہوئی تدبیر ہوتی ہے جس کا مقصد کسی طرح کا نفاق پیدا کرنا کسی کدورت یا انتقام کے جذبے کی تسکین کرنا ہوتا ہے، بسا اوقات بے باک عقل بہت تیزی سے محبت کے رشتے کو کاٹ دیتی ہے اور ظاہری سادہ لوحی سے ایک روحانی خوں ریزی کا سبب بن جاتی ہے۔ عقل پوری سچائی کے ساتھ وہ حصے ہی چنتی ہے اور انہیں یکجا کرتی ہے، جو حرص و انانیت کی تدبیر کے عین مطابق ہوتے ہیں۔

اقبالؔ یہاں نوجوان نسل کو اخلاقی اور روحانی نشو و نما کے اصول بتاتے ہیں۔ اسی شعر میں کہتے ہیں کہ آج کل کے نوجوان "غرق اندر مجاز" ہیں یعنی ظاہری ٹیپ ٹاپ اور رونق میں جذب ہیں۔ اس کا ایک مطلب تو غالباً یہ ہے کہ نوجوان مادے کی مختلف دل رُبا صورتوں پر فریفتہ ہیں، لیکن اس فریفتگی میں احتیاج کا بھی ایک پہلو ہے کہ جو کوئی مادی صورتوں کی کشش میں مبتلا ہوتا ہے، وہ ان کا محتاج ہو جاتا ہے، پھر اس کے وجود پر ان صورتوں کی حکمرانی لازمی ہے، اور وہ اپنے ہر فکر اور اپنے ہر عمل کا جواز خارجی اسباب میں بھی تلاش کرے گا، یعنی اپنے وجود، اپنی خودی کی ذمہ داری نہیں لے گا، اسے اپنے وجود کے شعور سے گریز کرے گا، ہر احتیاج کے جذبے کی تہہ میں جذبۂ بغاوت موجود ہوتا ہے کیونکہ ہر احتیاج سے خودی مجروح ہوتی ہے اور خودی کے زخم، خود اختیاری اور ذمہ داری کے لئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چھیننے میں مادی اسباب کوتاہیوں اور ناکامیوں کے بہانے بن جاتے ہیں، اور اقبالؔ کی طرح انسان یہ نہیں کہہ پاتا :

گنہگار غیورم ، فرد بے خدمت نمی گرم
ازاں داغم کہ بر تقدیر او بستند تقصیرم

اسی کے ساتھ اقبالؔ کا ایک اور تصور بھی دیکھئے اور وہ ہے " ترکِ سبب " یعنی مادی اسباب کی لپیٹ سے نکل جانا یہ معجزے کی بات نہیں، بلکہ انسانی عزم کی قوت کا اظہار ہے۔ قدیم یونانی طب میں زندگی اور موت کی درمیانی حالت کو (Krisos) ڈکیری سیس) کہتے تھے، یہ وہ حالت تھی، جب معالج عجزِ فن کا اظہار کر دیتا تھا اور مریض کے متعلق یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ زندہ رہے گا کہ نہیں، اس حالت پر پہنچنے کے بعد بسا اوقات مریض خود بخود، بغیر کسی ظاہری سبب کے روبصحت ہو جاتا تھا، اسی لفظ کیری سِس سے انگریزی کا لفظ (Crisis) نکلا ہے۔ " ترکِ سبب " میں بھی اسی قسم کی ایک اُمید موجود ہے، انسان صدق دل سے ایک ایسا عمل کرے جو " ترکِ سبب " کی بنا پر کیا گیا ہو، بظاہر اس سے اچھے نتائج نہ نکلتے ہوں، لیکن اچانک اچھے نتائج پیدا ہو جاتے ہیں۔

پاکستان کا قیام بھی " ترکِ سبب " ہی سے ہوا، اکثر ماہرینِ معاشیات نے اس تصور کو معاشی نقطۂ نظر سے خام اور کمزور قرار دیا، بعض سیاست دانوں نے شکستِ تصور کی پیش گوئیاں کیں لیکن جب صدقِ دل سے یہ تصور عمل میں آیا تو ہزار مصائب کے باوجود یہ ملک قائم ہو گیا۔ کیونکہ اس کی تہہ میں ایک روحانی تصور بھی تھا (G Lowes Dickenson) نے اسرارِ خودی پر جب تنقید کی اور اسے نیطشے کے تصورات کا عکس قرار دیا، تو علّامہ اقبالؔ نے نکلسن کو ایک خط لکھا، اور یہ کہا، کہ " ہم ان اداروں کی تشکیل اور تعمیر چاہتے ہیں جو اسلامی اقدار کی تربیت کریں۔ " آج جہاں ہم عدل و انصاف اور معاشی اور اجتماعی مساوات کے لئے کوشاں ہیں اور ان اداروں کی تخریب کر رہے ہیں، جو نو آبادیاتی نظام نے قائم کئے تھے۔ وہاں ہمیں اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ نئے اداروں میں اخلاقی روح بھی پھونکیں، جو انہیں گہرائی اور جامعیت دے سکے۔ وہ اخلاقی قدریں کیا ہیں۔

کم خور و کم خواب و کم گفتار باش　　گرد خود گم زندہ چوں پرکار باش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

منکرِ حق نزدِ ملاّ کافر است
منکرِ خود نزدِ من کافر تر است

آں بانکارِ وجود آمد عجول
این عجول وہم ظلوم وہم جہول

شیوۂ اخلاص را محکم بگیر
پاک شو از خوفِ سلطان و امیر

عدل در قہر و رضا از کف مدہ
قصد در فقر و غنا از کف مدہ

پھر آگے چل کر کہتے ہیں:

حرفِ بد برلب آوردن خطا است
کافر و مومن ہمہ خلقِ خدا است

آدمیت احترامِ آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی

بندۂ عشق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق

اقبالؔ نے علم کی نسبتِ پناہی کے لئے جن اقدار کی تربیت کو اہم سمجھا ہے ان کے بغیر شخصیت کی نشو و نما اور اس کے تخلیقی پہلوؤں کی پنداری ناممکن ہے اور یہی سبق ہے جو انہوں نے ایک عالم کا معلّم اور بالخصوص آزردگانِ خاک کا معلّم بن کر ہمیں دیا۔

✿✿✿✿✿✿✿✿✿✿

© rasailojaraid.com